ڈاکٹر ذوالفقار ملک ایم اے پی ایچ ڈی

عربی میں

مرثیہ اور تعزیہ نگاری کی مختصر تاریخ

تعازی کا واحد تعزیہ ہے جو عزی سے مصدر ہے جس کے معنی کسی کو صبر کی تلقین کرنے اور مصائب و آلام پر آمادہ کرنے کے ہیں۔ تعزیہ کے معنی حوصلہ بڑھانے یا اظہار ہمدردی کرنے کے ہوتے ہیں یہ لفظ قرآن مجید میں وارد نہیں ہوا البتہ احادیث نبوی میں مذکور ہے۔ جملہ اسلامی فرق کی فقہی کتب میں جنائز کے باب میں تعازی کی فصول موجود ہیں جن میں میت کے اقارب کے ساتھ اظہار ہمدردی کا بیان ہے۔

مراثی کا واحد مرثیہ ہے۔ یہ لفظ عربی مادہ رثی سے مشتق ہے۔ رثیتُ کے معنی ہیں "میں نے میت کے غم میں آنسو بہائے۔ اس کی تعریف کی اور اس کے اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کیا" اس کے معنے میت کی تعریف میں اشعار کہنے کے بھی ہیں۔ مرثیہ کے معنے متوفی کی تعریف میں کہی ہوئی نظم کے ہوتے ہیں۔

تعازی اور مراثی قدیم زمانے سے لکھے جا رہے ہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ اصناف ادب اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ خود حضرت انسان، قدیم زمانے سے جب بھی کبھی انسان مصائب و آلام کا شکار ہوتے تو انہوں نے ایک دوسرے کو ہمدردانہ الفاظ کے ذریعہ تسلی دینے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے انہوں نے نظم اور نثر دونوں کا سہارا لیا: ایسی نظم کو مرثیہ اور نثر کو تعزیہ کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ عربی زبان میں سب سے پہلے مرثیہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے فرزند ہابیل کی وفات کے موقع پر تحریر کیا تھا۔ روایت کے مطابق انہوں نے ذیل کے اشعار میں اپنے رنج و الم کا اظہار فرمایا تھا۔

تغیرت البلاد ومن علیہا　　فوجہ الارض مغبر قبیح

تغیر کل ذی حسن و طیب وقل بشاشة الوجه المليح

حضرت آدم علیہ السلام کی جانب ان اشعار کے انتساب کی بنا پر علماء ادب عربی کے مابین اختلاف ہے امام زمخشری کی رائے میں یہ اشعار حضرت آدم علیہ السلام کے نہیں ہو سکتے کیونکہ انبیاء نے کبھی اشعار نہیں کہے ابن کمال پاشا جنہوں نے ان اشعار کی شرح کی ہے، لکھتے ہیں کہ:۔

"اگرچہ یہ اشعار حضرت آدم علیہ السلام کے نہیں تاہم نفس مضمون انہی کا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے سریانی زبان میں نثر میں اپنے جذبات کا اظہار کیا اور بعد ازاں یعرب بن قحطان نے ان کو عربی اشعار میں منتقل کر دیا۔"

ایک اور روایت کے مطابق عربی زبان میں سب سے پہلا مرثیہ حمیر نے اپنے والد عبدالشمس سبا کی وفات کے موقع پر تحریر کیا تھا جو ۷۰ برس کی عمر میں فوت ہوا اور ہنوز وہ سد مارب کی تعمیر میں مشغول تھا کہ اس کی وفات ہوئی۔

مندرجہ بالا روایات سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہوا کہ مرثیہ اور تعزیہ نگاری عربی میں اتنی قدیم ہے کہ یہ کہنا عین صواب ہے کہ عربی شاعری کی ابتداء مرثیہ سے ہوئی۔ مروی ہے کہ پہلا عربی قصیدہ مہلہل بن ربیعہ نے اپنے بھائی کلیب بن ربیعہ کی وفات کے موقعہ پر لکھا تھا۔ کلیب کو بنو بکر نے قتل کر دیا تھا اور اسی قتل کی بنا پر بنو بکر اور بنو تغلب کے مابین نصف صدی تک جنگ جاری رہی یہ قصیدہ ایک موت کے موقع پر لکھا گیا تھا اس لیے مرثیہ ہوگا۔

عربوں کا دستور تھا کہ کسی کی وفات کے موقعہ پر عورتوں کے بین اور رونے کے بعد میت کے اہل خاندان میں سے کوئی شاعر اشعار میں اس کے اوصاف اور خصائل کی تعریف کرے۔ چنانچہ جاہلی دور میں اس طرح ان گنت مرثیے کہے گئے ان میں سے متعدد قصائد زمانے کی دستبرد کے ہاتھوں سے بچ کر قدیم عربی شعر کے مجموعوں میں محفوظ ہو گئے۔ ابو تمام کے حماسہ سے لے کر عربی اشعار کے جملہ مجموعوں میں مراثی پر علیحدہ باب موجود ہیں۔ بعض راویوں نے صرف مراثی جمع کر کے مجموعے تیار کیے۔ ان میں سے کوئی نحوی محمد بن زیاد الاعرابی کا مجموعہ متقطعات میراث حوادثات زمانہ سے بچ کر محفوظ رہا۔ جسے ادیب اور راوی ڈبلیو رائٹ نے ۱۸۵۹ء میں شائع کروایا۔

قدیم عربی شعراء میں سے جنہوں نے مرثیہ نگاری کی طرف خصوصی توجہ دی تمیم بن نویرہ بن جمرہ جس نے

اپنے بھائی مالک کے مرثیے کہے۔ خنساء جس نے اپنے بھائیوں صخر اور معاویہ کی یاد میں شعر کہے۔ اعشیٰ باہلہ جس نے مستنشر بن وہب کی یاد میں آنسو بہائے اور کعب بن سعد بن عمر بن عقبہ جو اپنے بھائی ابو المغوار کی یاد میں مرثیہ نگاری کرتا رہا، قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعراء میں سے الجمحی کی رائے میں تم سب سے بڑا مرثیہ نگار تھا لیکن الاصمعی کعب بن سعد الغنوی کو جلہ مرثیہ نگاروں کا سرخیل قرار دیتے ہیں۔

عربی شاعری شاید دنیا میں اسی بنا پر عدیم النظیر ہے کہ اس میں ہمیں شعراء کے اپنے بارے میں لکھے ہوئے مرثیے بھی ملتے ہیں۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ ایسا مرثیہ سب سے پہلے یزید بن حمق نامی ایک شاعر نے لکھا تھا۔ جسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اسے جب یہ محسوس ہوا کہ اس کا وقت آن پہنچا ہے تو اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات کو اپنے بارے میں مرثیہ لکھنے میں صرف کیا۔ یہ اس کا عظیم کارنامہ تھا کیونکہ ایسے اوقات میں خیالات کو مجتمع کرنا اور انہیں شعر کے قالب میں ڈھالنا کوئی آسان کام نہیں۔ دیگر شعراء جنہوں نے اپنے مرثیے لکھے یا اپنی قبروں کا تذکرہ کیا ان میں سے یزید بن حذاق، ابو ذویب الہذلی، عروہ بن حزام، طرماح بن حکیم اور مالک بن روب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مرثیہ نگاری کی یہ روایت بعد کے ادوار میں بھی جاری رہی اور ہر دور میں شعراء نے اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔

تعازی کا سب سے پہلا مجموعہ علی بن عبداللہ بن ابو الحسن المدائنی نے تیار کیا۔ جو بصری مکتب فکر کے نامور ادیب اور تاریخ نگار تھے۔ آپ بصرہ چھوڑ کر مدائن چلے آئے، کچھ عرصہ وہاں مقیم رہے۔ بالآخر بغداد ہجرت کر گئے اور وہیں ۲۲۵ھ میں وفات پائی۔ المدائنی نے اپنی ساری زندگی تصنیف و تالیف میں گزاری اور ابن ندیم کے مطابق اس نے دو سو کتابیں تصنیف کیں۔ المدائنی کی کتابوں کی فہرست میں ہمیں تعازی کے فن پر ایک کتاب "کتاب التعازی" کا تذکرہ ملتا ہے اس کتاب کا ایک جزو دمشق میں المکتبۃ الظاہریہ میں موجود ہے جو گیارہ اوراق پر مشتمل ہے۔ ان اوراق میں مصائب و آلام کے موقعہ پر مختلف مکاتیب فکر سے متعلق حضرات کے ملفوظات، مصیبت زدہ لوگوں کے صبر کے بارہ میں کہانیاں اور اکابر امت مثلاً علی بن ابی طالب ابن السماک، عمر بن ذر، محارب بن دثار، عبداللہ بن عباس اور عمر بن خطاب کے اقوال درج ہیں۔ جس میں ان بزرگوں نے لوگوں کو اعزہ و اقارب کی وفات پر صبر کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس کتاب میں مراثی موجود نہیں البتہ تعازی کے دوران بعض حسب حال اشعار موجود ہیں جنہیں شاید اس لیے نقل کیا گیا ہے کہ تعازی کے اثر کو بڑھایا جا سکے۔ اس بارے میں جن شعراء کے اشعار مندرج ہیں ان کے اسماء، درید بن صمہ۔ ابو خراشی الہذلی

عمیر الحنفی، اوس بن حجر، عمر بن معدیکرب اور حارثہ بن بدر ہیں۔

جاحظ اور ابن قتیبہ کی کتابوں میں بھی تعازی پر علیحدہ باب موجود ہیں۔

المبرد نے دعوےٰ کیا ہے کہ مراثی اور تعازی دونوں کو ایک کتاب میں جمع کرنے کی کوشش سب سے پہلے اس نے اپنی کتاب التعازی والمراثی میں کی ہے۔ تاریخ ادب پر مختلف کتابوں کی ورق گردانی سے ثابت ہوتا ہے کہ المبرد اپنے اس دعویٰ میں حق بجانب ہے۔ اس کتاب کی تالیف کی وجہ یہ ہوئی کہ المبرد کے استاد اور دوست ابو اسحاق القاضی وفات پاگئے۔ المبرد کو اس کا سخت صدمہ ہوا اور اس نے اپنے دوست کی وفات پر اپنی تسلی کیلئے یہ کتاب لکھی۔ ابو اسحٰق القاضی ۲۶۳ھ میں فوت ہوا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی اسی سال میں لکھی گئی۔

گمان غالب ہے کہ کتاب التعازی والمراثی مبرد کی تصنیفات میں آخری کتاب ہے۔ لہٰذا یہ کتاب المبرد کی اس دور کی یادگار ہے، جب وہ علم اور تجربے کے اعتبار سے اپنے معراج کمال کو پہنچ چکے تھے۔ المبرد کی یہ تصنیف اس کی دیگر تصنیفات سے اس بنا پر مختلف ہے کہ اس میں وہ بات سے بات پیدا کرتا ہوا ایک موضوع کو چھوڑ کر دوسرے موضوع کی طرف نکل جاتا بلکہ جو عنوان قائم کرتا ہے اس پر ہی روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ المبرد نے اپنے آخری ایام میں اپنی کتابوں کو ایک خاص ترتیب پر مرتب کرنا شروع کر دیا تھا۔

المبرد کی اس کتاب میں مواعظ، تعازی اور مراثی کے انتخاب موجود ہیں۔ کتاب کی ابتداء ابو اسحٰق القاضی کے اوصاف حمیدہ اور علمی مقام سے ہوتی ہے۔ جس کا تذکرہ کتاب کے متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ المبرد کا قول ہے۔ اگر کسی شخص کو جملہ کمزوریوں سے مبرا اور انسان کامل کہا جا سکتا ہے تو وہ ابو اسحٰق القاضی تھے۔ بعد ازاں المبرد اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے کہتا ہے کہ جملہ وفات پا جانے والوں کا بدل خداوند تعالیٰ ہے۔ لہٰذا اس کی یاد میں تمام مصیبتوں کو بھول جانا چاہیے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے اسوہ حسنہ تھے۔ ان کی وفات کے مقابلے میں دنیا کی تمام مصیبتیں ہیچ ہیں۔ بعد ازاں مصنف حضورؐ کی بعض احادیث درج کرتے ہیں جس میں آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو وصیت کی تھی کہ وہ اپنے اعزہ و اقارب کی وفات کے موقعہ پر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو یاد کریں اور سکون حاصل کریں۔ رسول کریم کی اس وصیت کو اکابرین امت نے یاد رکھا ہے اور جب ان پر اعزہ و اقارب کی وفات کی مصیبت نازل ہوتی وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات یاد کر کے ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے۔ اس ضمن میں المبرد نے عبداللہ بن اراکہ کے بعض اشعار کا ذکر کیا ہے جو اس نے اپنے بیٹوں کے مرثیہ میں کہے تھے۔